محرم: تلوار پر رگِ گلو کی کامیابی کا مہینہ

جناب شکیل حسن شمسی صاحب ''راشٹریہ سہارا'' دہلی

محرم الحرام اسلامی کیلنڈر کے ان مہینوں میں سے ہے، جن کو حرمت والا مہینہ قرار دے کر کشت وخون اور جنگ وجدال سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن افسوس صد افسوس کہ اسی مقدس مہینے میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے حضرت امام حسینؑ، ان کے اعزا واقارب اور اصحاب کا پاک کا خون عراق کے کربلا نامی مقام پر بہایا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسی مہینے سے ہجری کیلنڈر کی شروعات ہوتی ہے۔ اسلام کی آمد سے قبل عرب کے لوگ سال کا حساب کسی اہم واقعہ سے جوڑ کر بتاتے تھے۔ بعثت رسولؐ سے پہلے لوگ عام الفیل کو بنیاد بنا کر واقعات کا تذکرہ کرتے تھے۔ ہمارے رسولؐ کی ولادت ابرہہ کے ابابیلوں کے لشکر کے ذریعہ ہونے والی تباہی کے ایک سال بعد ہوئی تھی، اس لئے جب بھی رسول پاک کی ولادت کا ذکر ہوتا تھا تو لوگ یہی بتاتے تھے کہ رسول اکرمؐ کی ولادت ابرہہ کے حملے کے ایک سال بعد ہوئی تھی۔ یہاں پر اپنے ان قارئین کے لئے عرض کرتا چلوں جن کو اسلامی تاریخ کا علم نہیں ہے کہ ہمارے رسول اکرمؐ کی ولادت سے ایک سال قبل اس وقت کی طاقتور عیسائی حکومت یعنی Kingdom of Aksum (موجودہ ایتھوپیا) کے یمن میں تعینات گورنر ابرہہ نے مکہ پر حملہ کر کے کعبہ کو مسمار کرنے کا ارادہ کیا اور وہ ہاتھیوں کے ایک بڑے لشکر کو لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا، جب وہ کعبہ سے ۶-۵ کلومیٹر دور واقع مزدلفہ میں آ کر ٹھہرا تو اس پر آسمان سے ابابیل نامی پرندوں کے ایک لشکر نے حملہ کر دیا۔ یہ پرندے اپنی چونچ میں چھوٹے چھوٹے کنکر دبائے ہوئے تھے، ان کنکروں نے ابرہہ کے ہاتھیوں کی فوج کو تہس نہس کر کے رکھ دیا، اسی لئے عرب کے لوگ اس سال کو عام الفیل یعنی ہاتھی والا سال کہنے لگے۔

رسول اکرمؐ کی بعثت سے قبل عربوں میں ایک ایسا کیلنڈر رائج تھا، جس میں چاند کو ہی بنیاد بنایا گیا تھا، لیکن اپنے تہواروں کو موسم کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لئے یہ لوگ ۳؍سال میں ایک بار کسی نہ کسی مہینہ کو دوبارہ شروع کر دیتے تھے تا کہ سال کے ۳۶۵ دنوں اور قمری کیلنڈر کے ۳۵۴ دنوں کے درمیان جو فرق رہتا ہے، اس کو برابر کیا جا سکے اور سارے تہوار موسم کے حساب سے منائے جائیں۔ یہ سختیوں والے موسم میں عبادت کرنے سے بچنے کا ایک طریقہ بھی تھا۔ آنحضورؐ نے سال کو ۱۲؍مہینوں کا قرار دیا اور سال کے ۴؍مہینوں رجب، ذیقعدہ، ذی الحجۃ اور محرم کو حرمت والا مہینہ قرار دیا۔ اسلام اپنے مذہبی ارکان کی ادائیگی کو موسم کے تہوار میں بدلتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا تھا، اس لئے اس سلسلے میں اس نے چاند کی تاریخوں کو ۱۲؍مہینوں پر محیط کر دیا اور اس طرح کوئی مذہبی تقریب کسی موسم سے وابستہ نہیں ہو سکی۔

جب رسول اکرمؐ کو اپنا آبائی وطن چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت اختیار کرنی پڑی تو ہجرت کے بعد کے کچھ واقعات کو ہر سال کی پہچان کا ذریعہ بنایا گیا۔ مشہور ومعروف تاریخ نگار البیرونی نے آنحضور کی ہجرت کے بعد کی زندگی کے ۱۰؍برسوں کو الگ الگ نام بھی دیئے ہیں۔ ہجرت کے پہلے سال کو سال اذن کہا ہے، دوسرے سال کو جہاد کی اجازت دیئے جانے سے منسوب کیا ہے، تیسرے سال کو مشکل دور قرار دیا ہے، چوتھے سال کو نکاح کی مبارکباد والا سال قرار دیا، پانچویں سال کو

البیرونی نے زلزلہ کا سال کہا، چھٹے سال کو اطلاعات کا برس کہا، ساتویں سال کو فتوحات کا سال قرار دیا، آٹھویں سال کو مساوات کا سال کہا، نویں سال کو مراعات کا برس اور دسویں سال کو رسول اکرمؐ سے جدائی کا سال قرار دیا۔ مسلمان اپنی تاریخ کے اہم ترین برسوں کو ایک عرصہ تک اسی طرح سے یاد کرتے تھے، لیکن پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد جب خلافت راشدہ کا سلسلہ شروع ہوا اور دور دراز علاقوں پر پرچم اسلام لہرانے لگا تو بصرہ کے گورنر ابوموسیٰ اشعری نے خلیفۂ دوم حضرت عمر سے کہا کہ ان کو حکومت کی جانب سے جو خطوط ملتے ہیں ان پر کوئی تاریخ نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے یہ جاننے میں بہت دقت ہوتی ہے کہ یہ مکتوب نیا ہے یا پرانا۔ اس سوال کے اٹھنے کے بعد حضرت عمر نے اسلامی کیلنڈر کو باقاعدہ طور پر شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے صحابہ کرام اور اہل بیت سے مشورہ کیا، جس کے بعد حضرت عمر نے حضرت علیؑ کے مشورے کے مطابق اسلامی کیلنڈر کو ہجرت رسولؐ کے ساتھ منسوب کیا۔

اور اس طرح ایک ایسا کیلنڈر وجود میں آیا، جس میں مذہبی تقریبات کی انجام دہی سورج کے حساب سے نہیں، بلکہ چاند کے حساب سے ہوتی تھی۔ ویسے تو اس وقت عرب میں بسنے والے یہودی بھی چاند کے حساب سے ہی اپنی تقریبات منعقد کرتے تھے، لیکن ۳/سال میں ایک بار وہ Leap Year جوڑ کر اس کو سورج کے حساب سے ہی کرلیا کرتے تھے۔ عرب کی سرزمین سے کچھ فاصلے پر واقع ہندوستان کے سناتن دھرم کے لوگ بھی چاند پر مبنی کیلنڈر کی پیروی کرتے تھے، لیکن ان کے یہاں بھی ۳ سال بعد ایک مہینہ جوڑ دیا جاتا تھا، جس کے سبب یہاں کی مذہبی تقریبات پوری طرح موسم کے ساتھ وابستہ ہوگئی تھیں۔ عربوں کے پڑوس کی پارسی ریاست کا شمسی کیلنڈر سورج پر ہی مبنی تھا۔ پارسیوں کا نیا سال مارچ کے مہینے میں ۲۱/تاریخ کو شروع ہوتا ہے اور یہ سال پوری طرح موسمی تہواروں سے جڑا تھا۔ جب ایران میں برف باری بند ہوجاتی تھی تو پارسی قوم اپنا نیا سال مناتی تھی اور موسم بہار کے ساتھ ان کا نیا سال شروع ہوتا تھا۔ اس وقت کی سب سے بڑی طاقت رومن امپائر کا Julian کیلنڈر بھی سورج کے حساب سے چلتا تھا، جو حضرت عیسیٰ کی ولادت سے ۴۶ سال قبل مشہور حکمراں جولیس سیزر نے رومن کیلنڈر کو تبدیل کرکے رائج کیا تھا۔ جب رومن قوم نے عیسائی مذہب قبول کیا تو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے ایک ہفتہ بعد پڑنے والے سال کا پہلا دن یعنی یکم جنوری کرسمس کی تقریبات سے جڑ گیا اور جولیس سیزر کے کیلنڈر کو عیسوی کیلنڈر کہا جانے لگا۔ عیسائی زیادہ تر ایسے علاقوں میں آباد تھے، جہاں برف باری کی ابتداء دسمبر کے آخری ہفتہ میں شروع ہوتی تھی، اس لئے انہوں نے اپنے نئے سال کو برف کی آمد سے جوڑ دیا۔

مسلمانوں کو یہ افتخار حاصل تھا کہ ان کا کوئی تہوار موسم سے وابستہ نہیں تھا اور ایک بار جس موسم میں رمضان ہوتا وہ تقریباً ۳۳ سال بعد واپس اس موسم میں آتا ہے۔ اسلامی کیلنڈر کو عرب میں **التقویم الهجری** کہا جاتا ہے۔ ایران میں اس کو تقویم ہجری قمری کہا جاتا ہے اور برصغیر میں اس کو اسلامی تقویم کہا جاتا ہے۔ دوسری خلافت کے زمانے میں پہلا اسلامی سال یکم محرم کو جب شروع ہوا تو اس دن جولائی کی ۱۶/تاریخ اور عیسوی سال کا ۶۲۲ واں سال تھا، لیکن نہ تو خلافت راشدہ کے دور میں اس سلسلے میں کوئی جشن ہوا نہ ہی صحابہ کرام نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ کبھی کسی نے نہیں سنا کہ اصحاب رسولؐ ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارکباد دیتے ہوں کیوں کہ یہ مسلمانوں کی رسم نہیں تھی، بلکہ عیسائیوں کا طرز تھا یا یہودی اور پارسی اپنے نئے سال کا جشن مناتے تھے۔ میری کوتاہ نظر تو کہیں نہ ڈھونڈ سکی کہ صحابہ کرام یا تابعین میں سے کسی نے کسی کو محرم الحرام کی یا نئے سال کی مبارکباد دی ہو۔ یہاں پر یہ سوچنے کی بات ہے کہ ایک ایسے واقعہ کو ہجری تقویم کے لئے کیوں منتخب کیا گیا جو درد وغم کے ساتھ وابستہ تھا؟ رسول کریمؐ کی ولادت سے اس کو منسوب کیا جاسکتا تھا، جنگ بدر، جنگ خندق یا جنگ حنین جیسے ان معرکوں کے ساتھ

وابستہ کیا جاسکتا تھا، جن سے مسلمانوں کو بہت خوشی ملی تھی۔ اس کے برعکس ایک ایسے واقعہ کو چنا گیا، جس دن رسول اکرمؐ کو نہایت اضطراب اور غم کے عالم میں اپنا وطن چھوڑ نا پڑا تھا۔

محرم کے مہینے میں رسول اکرمؐ کے پیارے نواسے کی شہادت کے علاوہ کس قدر اہم اسلامی واقعات رونما ہوئے۔ (جن کی تفصیل بیان کرنے کے لئے الگ سے ایک مضمون کی ضرورت ہے) لیکن ادھر کچھ برسوں سے بغیر جانے بوجھے اور سوچے سمجھے بغیر اخباروں میں مبارکباد کے اشتہارات چھاپے جارہے ہیں اور اب تو موبائل کمپنیاں بھی اس کو فروغ دے رہی ہے، جب کہ اسلامی تاریخ میں اس کی کہیں نظیر نہیں ملتی ہاں البتہ اتنا ضرور میں نے سنا ہے کہ پچھلی صدی میں جب انگریزوں نے پہلی جنگ عظیم کی آڑ میں مسلم ممالک پر قبضہ کیا تو انہوں نے وہاں اپنا نیا سال جم کر منایا اور خوب خوب شراب لنڈھائی۔ کہا جاتا ہے ان ہی آقاؤں سے متاثر ہوکر مصر کے مسلمانوں نے ہجری سال کے پہلے دن جشن منانا شروع کیا، لیکن برصغیر میں نئے ہجری سال کی مبارکباد دینے کا سلسلہ ۷۰ کی دہائی میں شیعہ سنی فساد کے لئے بدنام رہے لکھنؤ سے بہت محدود پیمانے پر شروع ہوا تھا اور یہ محض ضداً ضداً کی بنیاد پر تھا، لیکن اب اس میں کافی شدت آ گئی ہے۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کا وہ طبقہ بہت رنجیدہ ہے، جو اس مہینے کو امام حسینؑ کے غم سے وابستہ کرکے دیکھتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ یہ مانتا ہے کہ محرم تلوار پر رگ گلو کی کامیابی کا مہینہ ہے۔ اس طبقہ کی نظر میں ماہ محرم امام حسینؑ کے غم کے لئے مخصوص ہے۔ اس لئے اگر اس بدعت کو انجام نہ دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ خاص طور پر جب کہ آج امریکہ اور اسرائیل کی جانب سے مسلمانوں کو منتشر کئے جانے کی زبردست سازشیں چل رہی ہیں اور ان سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے مسلمانوں کو اتحاد اور اتفاق کے رشتے میں پرونے کی شدید ضرورت ہے، کیا اس طرح کے اشتہارات یا ایس۔ ایم۔ ایس۔ سے قوم وملت کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

(بشکریہ روزنامہ راشٹریہ سہارا (اردو) ۱۵؍دسمبر ۲۰۱۰ء)

کون لڑوانا چاہتا ہے اہلِ لکھنؤ کو؟

۱۴؍نومبر کو جب ہندوستان بھر میں یوم اطفال کی تقاریب منائی جارہی تھیں، پرانے لکھنؤ کی سڑکوں پر ہنگامہ آرائی کا عالم تھا، بسیں پھونکی جارہی تھیں اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا جارہا تھا اور اس سبب کا باعث لکھنؤ کی ضلع انتظامیہ کی جانب سے اٹھایا گیا ایک غیر دانشمندانہ قدم تھا۔۔۔۔۔ ایسا لگتا ہے ضلع انتظامیہ کے کچھ لوگوں نے جو آر۔ ایس۔ ایس۔ کی ذہنیت کے مطابق کام کرتے ہیں شیعہ کالج کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے دوگروپوں کے اختلافات کو مایاوتی کی حکومت کے خلاف موڑنے کی حتی الامکان کوشش کی حالانکہ شہر کے شیعوں کو مایاوتی کی سرکار سے کوئی شکایت نہیں تھی پھر بھی احتجاج کا سارا رخ حکومت کی طرف ہوگیا کیوں کہ ضلع انتظامیہ نے مولانا کلب جواد اور مولانا آغا روحی صاحب کو گرفتار کرنے کی غلطی کرلی۔ ظاہر ہے دونوں کے چاہنے والے لکھنؤ میں بڑی تعداد میں موجود ہیں، اس لئے شہر کے کچھ علاقوں میں تشدد کے واقعات رونما ہوئے۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ تھی کہ میڈیا نے ان دو علماء کی گرفتاری کے خلاف ہونے والے احتجاج کو شیعوں کے دوگروپوں میں فساد کی شکل میں پیش کیا جب کہ شہر کے کسی حصہ میں بھی دو متحارب گروپوں کے آمنے سامنے آنے یا آپس میں مار پیٹ کرنے کی کوئی خبر کہیں نہیں چھپی۔

مجھے شیعہ کالج کے معاملے میں کچھ نہیں کہنا کیوں کہ وہاں کی سیاست سے میں ناواقف ہوں۔ مجھے تو فکر اس بات کی ہے کہ لکھنؤ جیسا وہ شہر جو کبھی شیعہ سنی فساد کے لئے جانا اور پہچانا جاتا تھا اچانک شیعہ فساد کے لئے کس طرح سرخیوں میں آ گیا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیعوں میں اختلافات رہے ہیں اور یہ اختلافات تقریباً ۷۰ سال پرانے ہیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان اختلافات کی وجہ سے کبھی شیعوں کے درمیان مار پیٹ نہیں ہوئی۔ لکھنؤ کو کسی زمانے میں شیعہ مسلمانوں کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی، کیوں کہ یہ شہر ہندوستان کے پہلے مرجع تقلید کا شہر تھا۔ یہاں

کے نوابین نے شیعہ فرقہ کے امور میں آیۃ اللہ العظمیٰ مولانا سید دلدار علی غفران مآبؒ کے خانوادے 'خاندان اجتہاد' کو اور سنی فرقہ کے امور میں علمائے فرنگی محل کے خانوادے کی رائے کو ہمیشہ اہمیت دی۔ اسی زمانے میں یہاں علماء کے دوسرے خانوادے بھی آباد ہوئے، جن میں مشہور و معروف عربی کتاب 'عبقات الانوار' کے مصنف اور مشہور محقق آیۃ اللہ میر حامد حسین موسوی کا خانوادہ بھی شامل تھا۔ ان خاندانوں کے درمیان بہت دوستانہ مراسم تھے، لیکن ۱۳۶۱ھ میں جب امام حسینؑ کے ۱۳۰۰ سالہ یوم شہادت کو منائے جانے کے لئے ایک کمیٹی انجمن یادگار حسینی کے نام سے تشکیل دی گئی اور اس کمیٹی کے زیر اہتمام امام حسینؑ کی شہادت کے متعلق ایک یادگاری کتاب نکالنے کا پروگرام بنایا گیا تو اس کتاب کو لے کر ایک تنازع کھڑا ہو گیا۔ ہوا یوں کہ خاندان اجتہاد کے ایک جید عالم آیۃ اللہ العظمیٰ مولانا علی نقی عرف نقن صاحب نے 'شہید انسانیت' کے نام سے ایک کتاب لکھ کر کمیٹی کے ممبران کے سامنے پیش کی۔ اس کتاب میں شامل کئی روایتوں کے خلاف ایک خاندان عبقات کے لوگوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا اور پوری شیعہ قوم دو گروہوں میں بٹ گئی، ویسے تو کتاب پر کمیٹی کے اندر بحث ہونا چاہئے تھی، لیکن انگریز بہادر کی سازشوں کے سبب یہ اختلاف عوامی شکل اختیار کر کے چائے خانوں اور ریستورانوں میں بحث کا موضوع بن گیا۔

لکھنؤ ہی نہیں لکھنؤ سے باہر کے شیعہ بھی نقنی اور سعیدی گروہوں میں بٹ گئے۔ علماء کے ان خانوادوں کا اثر مجلس و ماتم پر بھی پڑا اور مجلسوں میں ایک دوسرے پر لعن طعن کرنا ایک خاص فیشن ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود یہ اختلاف کبھی مار پیٹ یا گروہی تصادم میں تبدیل نہیں ہوئے۔ یہ اختلافات علمی بنیادوں پر تھے ذاتی مخاصمت یا آپسی رنجش کا اثر میں کم نظر آتا تھا۔ میں نے ہمیشہ یہی دیکھا کہ تمام تر اختلافات کے باوجود جب بھی دونوں خاندان کے علما کسی تقریب میں ملے تو انھوں نے علمی اختلافات کو ذاتی اختلافات میں تبدیل نہیں ہونے دیا اور ایک دوسرے کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ اس زمانے میں ایک دوسرے کے لئے خراب الفاظ استعمال کرنا معیوب تھا اور تو تکار کر کے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دونوں خاندانوں کے درمیان اختلافات کئی دہائیوں پر محیط رہے، لیکن لکھنؤ کے شیعہ علماء کی ایک نسل نے ان اختلافات کو کنارے رکھنے کا فیصلہ کیا اور خاندان اجتہاد کی جانب سے ڈاکٹر کلب صادق صاحب نے اس سلسلے میں کافی محنت و مشقت کی اور دونوں خاندانوں کے علماء کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کامیاب ہوئے۔ مولانا کلب عابد صاحب کے انتقال کے وقت خاندان عبقات سے تعلق رکھنے والے سب ہی علماء نے ان کے ایصال ثواب کے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بیچ میں کچھ اتار چڑھاؤ رشتوں میں رہا، لیکن حال کے دنوں میں ان دونوں خانوادوں کے درمیان ایک بار پھر زبردست اتحاد پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا آغا روحی صاحب، مولانا طاہر جرولی صاحب مرحوم کے صاحبزادگان اور مولانا کلب جواد صاحب ہر جگہ ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ شیعہ کالج کے معاملے پر بھی مولانا آغا روحی، مولانا کلب جواد اور مولانا طاہر جرولی کے صاحبزادگان ایک ساتھ ہیں اور شیعوں کا دوسرا گروہ مولانا مرزا محمد اطہر صاحب کی قیادت میں دوسری طرف ہے۔ شیعہ کالج جیسے ایک مقامی ادارے کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے معاملہ کا اچانک قومی اخباروں کی سرخیوں میں آنا کافی تشویش کا باعث ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیعہ کالج کے قیام کی تحریک مولانا کلب جواد صاحب کے جد امجد مولانا آقا حسن صاحب نے دوسرے شیعہ علماء کی مدد سے چلائی تھی اور وہی اس کالج کے بانیوں میں سے تھے، لیکن ان کی نسل کا کوئی آدمی کبھی بھی اس ادارے کا معمولی ممبر بھی نہیں رہا۔

بہر حال اب یہ قضیہ صرف لکھنؤ کے شیعوں تک ہی محدود نہیں رہا ہے، بلکہ ملک بھر کے امام باڑوں اور مسجدوں کا موضوع گفتگو بن گیا ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعہ بھی شیعہ اس معاملہ پر گفتگو کر رہے ہیں۔ سب اس کو گروہی تصادم سمجھ کر فکر مند ہیں، لیکن یہ

بھی ایک سچ ہے کہ پورے لکھنؤ میں کہیں پر بھی شیعوں کے درمیان نہ تو فساد ہوا اور نہ ہی مار پیٹ۔ شیعہ مظاہرین کا ٹکراؤ صرف پولیس سے ہوا تھا اور پولیس نے بھی بالکل مشتعل مظاہرین کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے وکٹوریہ اسٹریٹ پر کھڑی شیعوں کی کاروں کو نقصان پہنچا کر اور دکانوں اور گھروں کے شیشے توڑ کر تشدد کا بدلہ تشدد سے لیا پھر ضلع انتظامیہ کے کچھ لوگوں نے اخباروں میں اس معاملے کو شیعہ شیعہ فساد کی خبروں کی شکل میں پیش کیا، جب کہ شہر کے کسی علاقے میں شیعوں کے دو متحارب گروپ آمنے سامنے نہیں آئے نہ کہیں دو گروہوں نے ایک دوسرے پر پتھراؤ کیا۔

یہاں پر یہ بتانا ضروری ہے کہ جب میں رمضان میں لکھنؤ گیا تو مجھ سے ضلع انتظامیہ سے قربت رکھنے والے ایک شخص نے کہا تھا کہ لکھنؤ کی ضلع انتظامیہ کے کچھ لوگوں کی بھرپور طور پر یہی کوشش ہے کہ شہر میں شیعہ سنی فساد تو ہو نہیں پا رہا ہے اس لئے اب شیعوں کو آپس میں لڑوایا جائے۔ میں نے اس بات کا ذکر مولانا کلب جواد صاحب سے بھی کیا تھا، اپنے بھائیوں سے بھی کہا تھا کہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ محرم سے پہلے شیعہ شیعہ فساد کروانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ شہر میں شیعہ شیعہ فساد تو نہیں ہوا، لیکن اس کی تصویر ویسی ہی پیش کی گئی جیسا کہ ضلع انتظامیہ میں موجود کچھ عناصر چاہتے تھے۔ انگریزوں نے ڈیڑھ دو سو سال پہلے ضلع کا نظم و نسق چلانے والوں کو Divide and rule یعنی پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی جو پالیسی دی تھی اس پر آر۔ ایس۔ ایس۔ نواز حکام کا ایک گروہ آزادی کے ۶۳ برس گزر جانے کے بعد بھی عمل پیرا ہے۔ لوگ اگر یہ سوال کریں کہ شیعوں کو آپس میں لڑوا کر ضلع انتظامیہ کو کیا فائدہ ہوگا؟ تو اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ اوقاف کی زمینوں پر ناجائز قبضوں کو ہٹانے کی جو مہم شیعہ فرقہ کی جانب سے چل رہی ہے اس کو ختم کروانے کے لئے شیعوں کا آپس میں لڑنا بہت ضروری ہے۔ اس بات سے لکھنؤ کے لوگ اچھی طرح واقف ہیں کہ وقف کی زمینوں پر کئی بڑے سیاسی لیڈروں کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔

اگر شیعوں میں آپس میں فساد ہو جاتا ہے تو ان لوگوں کا کام آسان ہو جائے گا لیکن قارئین خیال رکھیں کہ شیعہ شیعہ فساد ہونے کی توقع بالکل نہیں ہے، کیوں کہ لکھنؤ میں جتنی بھی بڑی مجلسیں ہوتی ہیں ان کو مولانا آغا روحی، مولانا کلب جواد اور مولانا حمید الحسن صاحبان خطاب کرتے ہیں اور ان تینوں کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے، اس لئے محرم میں کسی چپقلش کا امکان نہیں ہے۔

بہرحال محترمہ مایاوتی کی حکومت کو ضرور ایسے حکام کی طرف توجہ کرنا ہوگی، جو آر۔ ایس۔ ایس۔ سے تعلق رکھتے ہیں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑوانے کی اپنی پرانی روش کے مطابق اب شیعہ فرقہ میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ راشٹریہ سہارا (اردو) ۱۷ ر نومبر ۲۰۱۰ء)

۞۞۞

بقیہ۔۔۔۔۔ مقتول: فاتح اعظم

لیکن جو بھی ہوں وہ ایسے ہوں، جن کا جواب یہ دنیا نہ لا سکے۔ امام حسینؑ جن بہتر ساتھیوں کو کربلا کے میدان میں لائے تھے وہ بہتر کا عدد نہیں تھا، بلکہ بہتر اکائیاں تھیں، جن کو امام حسینؑ نے برابر سے لا کر کھڑا کر دیا تھا، کیوں کہ بہتر اکائیوں کو اگر کسی صفحہ پر برابر سے لکھ دیا جائے تو اتنا بڑا اعدد بن جائے گا، جس کا حساب کوئی Calculator نہیں لگا پائے گا۔ امام حسینؑ کا ہر سپاہی عزم و استقلال کی ایک ایسی اکائی تھا، جس کا کوئی جواب نہیں تھا، اسی لئے ان کو صرف بہتر افراد کی شکل میں نہیں دیکھا جا سکتا، بلکہ ان کو ایک اکائی کی شکل میں رکھا جانا چاہئے۔ امام حسینؑ اپنے ساتھ صبر و ثبات کے وہ نمونے لائے تھے جن کو ایک فرد کی شکل میں دیکھا ہی نہیں جا سکتا اسی لئے بہتر افراد پر مشتمل یہ لشکر ایک لاکھ کے لشکر سے یوں ٹکرایا کہ ابرہہ کی فوج کی طرف فوج یزید کی دھجیاں اُڑ گئیں۔ امام حسینؑ کے بہتر سپاہیوں نے یزید کی فوجوں کو ایسی شکست دی کہ اس کا نام و نشان باقی نہیں رہا اور حسینیت کا پرچم آج تک لہرا رہا ہے۔ (بشکریہ روزنامہ راشٹریہ سہارا (اردو) ۱۷ ر دسمبر ۲۰۱۰ء) ۞۞۞